کفر و ایماں
520
ح

ضربُ المثل رہے گا محبت میں میرا نام
آئیں گے میرے بعد فقط نوحہ خوانِ عشق

(حافظ محمد ولایت اللہ)

❋❋

کفر و ایماں

کفرو ایماں

ہری چند اختر

قیمت :- چار روپے

ناشر :- ست پال ۳۳-۴ کوچہ خان خانان اردو بازار- دہلی
ملنے کا پتہ :- مکتبہ جامعہ اردو بازار، دلّی
پرنٹر- یونین پرنٹنگ پریس اردو بازار دلّی

پنڈت ہری چند اختر مرحوم

جس طرح شاعری کا جوہر خداداد عطیہ ہوتا ہے اسی طرح انسانی طبیعت کے بعض اور محاسن بھی ایسے ہوتے ہیں جنھیں اکتسابی نہیں کہہ سکتے۔ مثلاً طبیعت کی شوخی، مزاجیہ ملکہ، حاضر جوابی، ذہن و ذکاوت وغیرہ۔ شعرا کی برگزیدہ جماعت میں ان نعمتوں کی تقسیم مساوی صورت میں نہیں پائی جاتی۔ کسی کو صرف شاعری کا جوہر عطا ہوا ہے اور باقی نعمتوں سے اسے محروم رکھا ہے۔ کسی کو اس کے ساتھ ایک آدھ نعمت اور دے دی ہے۔ بہت کم شاعر ایسے نظر آتے ہیں جن کا دامن ان تمام قدرتی نعمتوں سے مالا مال نظر آتا ہو۔ اردو کے شعراء میں مرزا غالب، حضرت داغ، حضرت اکبر اور حضرت ریاض خیرآبادی ان نعمتوں سے پورے طور پر بہرہ مند ہیں اور یہی چیزیں ہیں جو پرواز بن کر ان کو اوج شہرت پر اتنی دور لے اڑی ہیں کہ وہ اپنی جماعت کے دوسرے ارکان سے ممتاز نظر آتے ہیں۔ اسی ضمن میں بیدل انشا کو بھی شمار کر لیجیے۔ یادش بخیر پنڈت ہری چند اختر بھی ان تمام ادبی اوصاف کا ایک دل کش مرقع تھے۔ ان کی طبیعت میں بھی شوخی اور مزاح کے جوہر کوٹ کوٹ کر بھرے ہوئے تھے۔ ان کی نثر نگاری کا کثیر حصہ مزاحیہ اور صرف مزاحیہ ہے مگر افسوس کہ انھوں نے نثر کو اپنے منظوم کلام کی کوئی یادداشت یا بیاض مرتب

کی اور نہ اپنے مجموعۂ نثر کی۔ نثر تو وہ سرکاری ملازمت کے خیال سے ہمیشہ فرضی تخلص کے ساتھ اور بسا اوقات اس فرضی تخلص سے بھی بے نیاز رہ کر ادارہ کی آڑ ہی میں لکھتے رہے۔ ان کے مزاحیہ وار اتنے خارا شگاف اور اتنے بھرپور ہوتے تھے کہ مخالف تاب نہ لا سکتا تھا اور فوراً سپر افگن ہو جاتا تھا۔ شوخی میں متانت، اور متانت میں شوخی ان کی تحریروں کا نمایاں وصف تھا۔ کبھی کبھی شوخی اور متانت کی حدوں سے پار ہو جاتے تھے تو ان کا قلم صف شکن تلوار سے کم نہ ہوتا تھا اور وہ اس میدان میں قلم اور تلوار دونوں کے مالک نظر آتے تھے۔ طبیعت کی شگفتگی کا یہ عالم تھا کہ غم و الم میں بھی ان کے ہونٹ متبسم نظر آتے تھے۔ ان کے اشعار میں بھی جو خواہ کسی موضوع پر ہوں مزاح اور شوخی دونوں ہم دست ہو کر کھیلتے دکھائی دیتے تھے۔ حاضر جوابی کے بیان میں صرف یہی ایک مثال کافی ہے کہ ایک مشاعرہ میں ایک برگزیدہ شاعر اپنی غزل پڑھ رہے تھے۔ غزل کی زمین تھی —— رات کتنی ، گھات کتنی ۔ ایک شعر کا پہلا مصرع یہ تھا ع

یہ دل ہے یہ جگر ہے یہ کلیجا

شاعر نے ابھی پورا شعر نہ سنایا تھا اور پہلے مصرع کو دوبارہ پڑھ رہے تھے ع

یہ دل ہے یہ جگر ہے یہ کلیجا

کہ اختر نے دوسرا مصرع کسی قدر آواز سے اس طرح سنا دیا ع

قسائی دے گیا سوغات کتنی

یہ نہیں کہا جا سکتا کہ انھوں نے اپنی شوخ طبیعت کے تقاضے سے یہ پیوند لگا دیا یا مصرع اوّل کے اس سقم کو دیکھ کر کہ جگر اور کلیجا دو نہیں ہوتے اور مصرع میں جگر کے بعد کلیجا

کہنا بے معنی بات ہے۔ تنبیہ کے طور پر دوسرا مصرع فی البدیہہ سُنا دیا۔ وجہ کچھ بھی ہو ان کی خاطرِ جمعیت کے ثبوت میں یہ لطیفہ بہت کافی ہے۔ اسی قسم کے سیکڑوں نہیں ہزاروں ملفوظات ہوں گے جنھیں ایک جگہ جمع کیا جاتا تو یہ مجموعہ بہت قابلِ قدر ہوتا۔

نکتہ فہمی، نکتہ دانی، نکتہ شناسی، نکتہ پروری اور نکتہ نوازی کا یہ عالم تھا کہ بات میں سے بات نکالتے تھے۔ شعر یا نظم کے کسی نمایاں سقم پر بڑے بڑوں سے اُلجھ پڑتے تھے۔ لاہور میں انھوں نے نہ ارمان دہلوی کو معاف کیا نہ مولانا تاجور کو۔ تعقیدِ لفظی کے سقم پر مولانا ظفر علی خاں سے بھی بے طرح اُلجھ پڑے اور اجزائے فعل کو الگ الگ کر کے یعنی "کون بولے گا" کی جگہ بولے کون گا، کھوے کون گا، ٹوٹے کون گا، کھائے جھکولے کون گا کی زمین میں ایک طومار لکھ مارا جس کے تمام مضامین مولوی ظفر علی خاں کے عادات و خصائل کا آئینہ تھے۔ جو شعر زبان اور صرف زبان ہی زبان ہو اور اس میں معنویت یا شعریت قطعی طور پر مفقود ہو مثلاً ؎

تمھیں چاہو تمھیں چاہو تمھیں چاہو رقیبوں کو

کبھی ہم نے نہ چاہا تھا نہ چاہیں گے نہ چاہا ہے

ایسے اشعار کو کرتب سے تشبیہ دے کر مضحکہ اڑاتے تھے اور بعض دفعہ اس قسم کے اشعار کی پیروڈی سے بھی گریز نہ کرتے تھے۔ بہت زندہ دل اور شگفتہ مزاج تھے۔ پُرگو اتنے کہ قلم برداشتہ لکھتے تھے۔ ان کی نثر و نظم کا مکمل مجموعہ اگر تلاش سے مل سکتا تو شاید دو تین ہزار صفحات میں بھی نہ سما سکتے اور زبانِ حال سے یہی کہتا کہ ع

تنگ ہے دل وسعتِ دامانِ محشر دیکھ کر

اپنے افکارِ طبع سے صرف چند چیزیں اُن کو یاد تھیں، مشاعروں میں انھیں سے

کام لیتے تھے اور انھیں کو نمک مرچ لگا کر ان کا ذائقہ کچھ ایسا چٹ پٹا بنا دیتے تھے کہ بار بار سن کر بھی لوگ انھیں چیزوں کی فرمائش کرتے رہتے تھے اور یہی اشعار قندِ مکرر کا لطف دے جاتے تھے۔ اپنے بعض اشعار پر دو چار مزاحیہ فقرے کچھ اس طرح کہتے تھے کہ ہر شخص ان کی زندگی بخش طبیعت کا معتقد ہو جاتا تھا اور یہ پوری محفل پر چھائے ہوئے نظر آتے تھے۔

ان کے منظوم کلام کے متعلق کہا جا چکا ہے کہ انھوں نے اس کی کوئی یادداشت قلمی صورت میں اپنے پاس نہیں رکھی۔ ایسے لاابالی شاعر بھی بہت کم ہوں گے جو اپنے ارشادات اور ملفوظات کی حفاظت میں اتنے غیر محتاط اور اتنے غافل رہے ہوں۔ تلاش سے جو کچھ حاصل ہوا وہ اتنا کم ہے کہ اسے مشتے نمونہ از خروارے کہنا چاہیئے۔ اختر زمانہ حال کی اس شاعری کا جس میں فنی اصولوں اور زبان کی صحت سے کھلی بغاوت کی گئی ہو، بہت مضحکہ اڑاتے رہتے تھے اور ہمیشہ اس بے راہ روی اور بے معنی و لایعنی ترکیبوں کو بے بہار شاعری سے منسوب کرتے تھے۔ ہنستی ہوئی خزاں پر روتے تھے اور روتی ہوئی بہار پر ہنستے تھے۔ سیم گوں خاموشیوں اور تڑپتی ہوئی مدہوشیوں کو دیکھ کر یہی کہتے تھے ع

بسوخت عقل ز حیرت کہ ایں چہ بوالعجبی است

وہ کلاسیکل شاعری کے دلدادہ و وارفتہ تھے اور فنی اصول، فنی قواعد اور فنی نکات کو خوب سمجھتے تھے اور جو کلام اس ترازو پر پورا نہ اترتا تھا ہمیشہ اس کا مضحکہ اڑاتے تھے اور عجیب و غریب پھبتیاں کستے رہتے تھے۔

اب ان کے منظوم کلام کا کچھ اقتباس بھی ملاحظہ ہو۔ زندہ دلی، شگفتگی، شوخی اور مزاحیہ چاشنی کے ساتھ ساتھ حقائق نگاری۔ یہ چار پانچ نمایاں خصوصیتیں ان کے کلام میں آپ کو جا بجا نظر آئیں گی ؎

تو مرے اعمال کا پابند نکلا حشر میں

اے خدا میرے خدا تجھ کو خدا سمجھا تھا میں

"قادرِ مطلق" کی قادریت پر کتنی کڑی تنقید کی ہے۔ یہ مضمون بالکل نیا ہے اور بڑی صفائی سے بیان کر دیا ہے۔ دونوں مصرعوں کی ساخت بھی بے ساختہ اور بے تکلف ہے ؎

نوید سر بلندی دی منجّم نے تو میں سمجھا

سگانِ دہر کے آگے دوتا ہونے کا وقت آیا

ملازمت کی غلامانہ زندگی کو جناب محروم نے بھی ایک فارسی قطعہ میں بُری طرح مطعون کیا ہے۔ اس قطعہ کا آخری مصرع یہ ہے ؎

بہ سگاں ادب نمودم بہ خراں سلام کردم

اختر نے بھی ایسی ہی غلامانہ زندگی اور حکّام کی نخوت و رعونت کو بُری طرح آڑے ہاتھوں لیا ہے اور جس چیز کو لوگ سربلندی اور اس کے حصول کی خبر کو نوید سربلندی کہتے ہیں اس کی ذلت و تحقیر ثابت کرنے کے لئے زور دار تشنیع سے کام لیا ہے۔ یہ شعر نہیں تازیانہ ہے ؎

ہمیں بھی آ پڑا ہے دوستوں سے کام کچھ یعنی

ہمارے دوستوں کے بے وفا ہونے کا وقت آیا

دوستوں کی نمائشی دوستی پہ طعن اتنا شدید ہے کہ دل مجروح ہو جاتا ہے۔ نظر مصرع ثانی پر جم جاتی ہے اور مصرع اوّل کے یعنی کا جو غیر صحیح مقام ہے اس پر متوجہ ہی نہیں ہوتی۔ یہ شعر حقائق نگاری کی ایک نمایاں مثال ہے ؎

ابھی تو بھی دیکھنا چاہتا ہوں	نہیں چاہتا اُن کو یا چاہتا ہوں
وہ کہتے ہیں تم مجھ سے کیا چاہتے ہو	یہی کچھ تو میں جاننا چاہتا ہوں

مری نیتوں پر نظر رکھنے والو   خدارا بس ذرا دیکھو میں کیا چاہتا ہوں

میں سمجھا وہ کچھ پوچھنا چاہتے ہیں   وہ سمجھے کہ میں کچھ کہا چاہتا ہوں

پہلا اور تیسرا شعر دفترِ معانی ہیں۔ ان کی معنویت، ان کے کنائے اور ان کی شعریت نکتہ شناسوں ہی کے ذوقِ صحیح سے پوچھیے۔ ان میں جو وجدانی کیفیت ہے وہ لفظوں میں بیان نہیں ہوسکتی۔ دوسرا اور چوتھا شعر اختر کے خاص رنگ میں ہے۔ اس قسم کا اندازِ بیان صاف طور پر ظاہر کرتا ہے کہ ان کی مزاحیہ طبیعت کتنی نکتہ پرور ہے۔ یہ بات بھی خاص طور پر قابلِ غور ہے کہ چوتھا شعر کس خاص موقع سے تعلق رکھنے والا اور کس عالم کا ترجمان ہے ؎

مجھ کو دیکھا پھوٹ کے رویا   اب سمجھا سمجھانے والا

کتنا بے پناہ شعر کہا ہے۔ معنویت اور شعریت دونوں دست و گریباں نظر آتے ہیں۔ دونوں مصرعے درد و غم کی تصویر ہیں۔ اتنی مختصر زمین میں یہ ڈھلے ہوئے مصرعے، پھر بیان کی یہ صفائی یہ سلاست قابلِ دید ہے۔ معنویت کی گہرائی مزید برآں۔ ایسا جامع شعر اور ایسا وسیع مضمون قوتِ بیانیہ کا اعجاز ہے۔ ناصح کی نصیحت کیوں کارگر نہ ہوئی اور بیماری کا انجام کیا ہوا۔ یہ دو باتیں اس شعر کی جسے قصر الادب کہنا چاہیے بنیاد ہیں۔ اس بنیاد پر جو تعمیر اٹھائی گئی ہے اس میں اختر کی سحر کاری کتنی داد طلب ہے۔ داد طلب ہی نہیں فریاد طلب بھی ہے۔ ناصح کی طبیعت میں جو انقلابِ عظیم پیدا ہوا۔ پھوٹ کے رویا۔ یہ الفاظ اس انقلابِ عظیم کی اتنی مکمل وضاحت کر رہے ہیں کہ کوئی خاص بات نہ کہنے کے باوجود سب کچھ کہہ دیا گیا ہے۔ یہ شعر پورے دیوان پہ بھاری ہے ؎

بس شیخ و پنڈت دھرم اور اسلام کی باتیں کریں

کچھ خدا کے قہر کچھ انعام کی باتیں کریں

یہ سنائیں پاک نغمے اولیں الہام کے

وہ خدا کے آخری پیغام کی باتیں کریں

ہم کھڑے ہنستے رہیں اور دل میں یہ کہتے رہیں

اب یہ رخصت ہوں تو ہم کچھ کام کی باتیں کریں

یہ ایک قطعہ ہے۔ شیخ اور پنڈت کی بے مقصد اور دور از کار بحث کو تضیع اوقات قرار دیتے ہوئے کتنی بھرپور ملامت کی ہے۔ مزا یہ ہے کہ دونوں سے کچھ کہا بھی نہیں اور پورا احتجاجی جذبہ بھی کارفرما ہے۔ پانچواں مصرع اس ملامت اس تضحیک اور احتجاج ان تینوں باتوں کے بیان میں بہت پر لطف ہے۔ پھر چھٹے مصرعے کا پہلا حصہ معنویت کا ڈنکا بجا گیا ہے "اب یہ رخصت ہوں" یہ الفاظ اپنی بیزاری اور احتجاجی جذبے کو ظاہر کرنے کے لئے کس قدر جامع ہیں ؎

مرے چمن کی خزاں مطمئن رہے کہ یہاں

خدا کے فضل سے اندیشۂ بہار نہیں

یہ شعر بھی اختر کا شاہکار ہے۔ "خدا کے فضل سے" ان الفاظ کے طنزیہ انداز کی داد کہاں تک دی جائے۔ خزاں کا اندیشہ تو ہوا کرتا ہے۔ بہار کے ساتھ اندیشہ ایک نادر ترکیب ہے جس کے جواز سے یہاں انکار نہیں ہو سکتا۔ یہ شعر عجیب اسلوب سے کہا گیا ہے۔ چونکہ مضمون رجائی ہیں تو مزاحیہ معنویت ہے وہ اس شعر کو اور بھی سحر حلال بنا دیتی ہے۔

اپنی مظلومی اور احباب کی بدسرشتی کو دام تزویر بنایا ہے زمانے کے لئے

ان کی موہوم شقاوت کے گلے کرتا ہوں اپنی معلوم خباثت کو چھپانے کے لئے

یہ بھی ایک قطعہ ہے۔ بیان کا یہ اسلوب بڑا نادر ہوتا ہے کہ دوسروں کی برائی اپنی ذات پر ڈال کر بیان کی جائے۔ دونوں شعر اختر کی قدرت بیان کا بہترین نمونہ ہیں۔ حقائق نگاری جو اختر کے کلام کا طرۂ امتیاز ہے اس کے ثبوت میں یہی ایک قطعہ کافی ہے۔ دوسرے شعر میں موہوم شقاوت اور معلوم خباثت کے ٹکڑے تلاش کے لحاظ سے بھی اور معنویت کے لحاظ سے بھی مستغنی عن التوصیف ہیں۔ شقاوت اور خباثت کے الفاظ نے بیان میں جو زور پیدا کیا ہے اور اس بری عادت کی مذمت جو عام طبائع کے میلان پر حاوی ہے جس شدت سے کی گئی ہے وہ اعجاز بیان ہے

وہ اچھے کٹے یا برے کٹ گئے ہم مل کے دو دن گزارے تو تھے

دلوں میں بھی فرق آگیا تھا تو کیا نگاہوں کو حاصل نظارے تو تھے

برا جانتے تھے تو پھر کیا ہوا برے ہی سہی ہم تمہارے تو تھے

تینوں شعر تغزل کے لحاظ سے لاجواب ہیں۔ انھیں پڑھ کر میر حسن کی مثنوی کا انداز بیان یاد آجاتا ہے۔ وہی مترنم بحر، وہی بے ساختہ اور بے تکلف اسلوب بیان، وہی صفائی اور سلیس زبان، آورد کا نام تک نہیں۔ امتیازی فرق یہ ہے کہ وہ مثنوی تھی یہ تغزل ہے اور تغزل بھی بہت کامیاب ہے

خودی کی ابتدا یہ تھی کہ اپنے آپ میں گم تھا

خودی کی انتہا یہ ہے خدا کو یاد کرتا ہوں

خودی کی ابتدا ایسی ہی ہوتی ہے کہ اپنا آپ بھول جاتا ہے مگر اس غرور اور اس خودی

کا انجام ہمیشہ یہ ہوتا ہے کہ آدمی کہیں کا نہیں رہتا اور اس مصیبت میں بار بار خدا کو یاد
کرتا ہے اور اس کے کرم کا متمنی۔ یہ حقیقت تھی جسے اس شعر میں بیان کرنا مقصود تھا۔
لہٰذا انجام اور خدا کو یاد کرنا یہ دو ٹکڑے خود ہی عبرت ناک انجام ظاہر کرنے کے لئے بہت
جامع ہیں۔ کہاں تو یہ نخوت کہ خدا کا تو ذکر ہی کیا اپنے آپ کو بھی بھول گئے اور کہاں یہ
صورتِ حال کہ بار بار خدا یاد آتا ہے۔ بیان کی صفائی اور مفہوم کی وضاحت اس سے بہتر
اور کیا ہوگی ؎

لب پر ہی کبھی آ نہ سکا نام تمہارا ۔۔۔ دل نے تو کئی بار کئی بار پکارا
اک بار جو مل جائیں وہ بچھڑے ہوئے لمحے ۔۔۔ سو بار مجھے تلخیٔ ایام گوارا

پہلا شعر ضبطِ راز اور ضبطِ محبت کی تصویر ہے جو بہت ہی دل کش اور بہت ہی مکمل ہے۔
دوسرے شعر میں اک بار اور سو بار کا تقابل حسنِ بیان کی جان اور خوش بیانی کا ایمان ہے۔
سو بار مجھے تلخیٔ ایام گوارا۔ یہاں فعل کا حذف اور بھی پُر لطف ہے۔ دونوں شعر اختر کے
حسنِ بیان کا روشن ثبوت ہیں اور سراسر جذباتی یعنی سراپا تغزل۔

اس نہایت مختصر مجموعۂ کلام میں جو بڑی تلاش سے دستیاب ہوا، اس قسم
کا زندگی بخش انتخاب اور بھی پیش کیا جا سکتا ہے۔ مگر کلامِ اختر کی جن چند خصوصیتوں کا
پہلے ذکر کیا گیا ہے ان کے ثبوت میں جو کچھ لکھا جا چکا ہے اور جتنا انتخاب پیش کیا گیا
اربابِ نظر کے لئے وہی کافی معلوم ہوتا ہے۔ افسوس کہ پنجاب کے آسمانِ ادب کا یہ
درخشندہ ستارہ (اختر) یکم جنوری ۱۹۵۵ء کو موت کی آندھی کے ایک ہی جھونکے سے
بجھ کر رہ گیا۔ کیا خوب آدمی تھا خدا مغفرت کرے۔

جوش ملسیانی

ہری چند اختر کی یاد میں

پنڈت ہری چند اختر کا نام بڑی مدت سے سنتا آیا تھا۔ حفیظ کے "سوز و ساز" پر ان کا مقدمہ دیکھ کر ہی میں ان کی نظر اور بلندی کا قائل ہو گیا تھا۔ مگر ملاقات کی نوبت بہت بعد میں آئی۔ لکھنؤ میں ایک دن ریڈیو پر کوئی مشاعرہ نشر ہو رہا تھا۔ اختر نے غزل پڑھی جس کا ایک مصرعہ اب تک ذہن میں محفوظ ہے

اماں ملی نہ صحرا میں تو دیوانے کہاں جاتے

اس کے بعد ان سے ملنے کا اشتیاق بہت بڑھ گیا۔ لکھنؤ ریڈیو والوں سے کہا کہ اگلے مشاعرے میں ان کو ضرور بلائیں۔ انھوں نے بلایا۔ اختر نے وعدہ کر لیا کہ شرکت کریں گے مگر عین وقت پر نہ آئے۔ شاعری کی پختگی تو کلام سے ظاہر ہوتی تھی لاابالی پن اس حرکت سے ظاہر ہو گیا۔

دوسرے سال پھر انھیں زحمت دی گئی۔ حضرت تشریف لائے۔ مجھ سے ملنے گھر پر آئے۔ میں انھیں ساتھ جونپور کے ایک مشاعرے میں لے گیا۔ راستے میں بڑے مزے کی گفتگو رہی۔ انھوں نے اپنے شعر بہت کم سنائے گرامی، اقبال، ظفر علی خاں، تاجور، تاثیر، سالک کے بہت سے لطیفے اور واقعے بیان کیے۔ بسمل سعیدی بھی سفر میں شریک تھے۔ جونپور کے مشاعرے میں انھیں پڑھتے دیکھا، کلام سنا، مشاعرے میں شعراء پر دل چسپ اور برمحل فقرے سنے، زندگی، ادب، مشاعروں، کانفرنسوں، دوستی، دشمنی، لاہور کی ادبی فضا، دلی کی انجمنوں کی کش مکش، سرکاری ملازمت سب پر گفتگو رہی۔ مجھے محسوس ہوا کہ ایک بڑے باغ و بہار آدمی، ایک بڑے مخلص اور بے ریا دوست، ایک فاضل، ایک کڑھتے ہوئے انسان اور ایک زخموں کی کائنات دل میں لیے ہوئے محفل کو زعفران زار بنانے والے سے، ادب کے اور ادبی صحبتوں کے سیاح سے مل رہا ہوں۔ میں کسی سے جلد متاثر نہیں ہوتا۔ اختر کا رعب بھی میرے اوپر نہیں پڑا مگر ان سے مل کر بڑا خوش ہوا کہ میں ایک اچھے شاعر، ایک صاحب نظر، ایک یاروں کے یار سے مل رہا ہوں اور مل کر بڑے نفع میں ہوں۔

پنڈت جی شیرانی کے شاگرد تھے۔ غالباً فارسی میں ایم اے کیا تھا۔ زبان اور فن پر بڑی گہری نظر رکھتے تھے۔ گرامی اور اقبال کی صحبتیں اٹھائے ہوئے تھے۔ تاجور کے ساتھ اور ظفر علی خاں جیسے بجلیت کے ساتھ معرکے جھیلے ہوئے تھے۔ حفیظ کی شہرت میں سر عبدالقادر کے بعد ان کا بھی ہاتھ تھا۔ وہ بڑے اچھے

دوست تھے مگر اپنے دشمن تھے۔ ان کے سارے دوستوں نے ترقی کی اور کہاں سے کہاں پہنچ گئے۔ یہ حضرت
برابر تنزل کرتے رہے اور اسی میں مگن رہے۔ اگر کوئی لطیفہ شروع ہو جائے تو اختر اپنے ذاتی کام بھی
بھول جاتے تھے۔ میری دعوت پر انجمن ترقی اردو ہند کی ایک کانفرنس میں جولائی ۱۹۵۷ء میں علی گڑھ
آئے۔ سخت گرمی تھی، کچھ جان پریشان تھے۔ اختر پر موسم کا کوئی اثر نہ تھا۔ کانفرنس کی کارروائی میں گرمجوشی
سے حصہ لیا۔ مشاعرے میں شعرا پر فقرے چست کرنے والے تھے مگر میرے آنکھ کے اشارے کو سمجھ گئے
اور باز رہے۔ میں چاہتا تھا کہ وہ آتے ہی بے تکلف نہ ہوں۔ بڑی اچھی غزل پڑھی۔ لطف یہ کہ بہت سادہ
طریقے سے پڑھتے تھے۔ اشعار میں سستی جذباتیت کا نام نہ ہوتا تھا، بڑے پتے کی باتیں، زندگی کے
گہرے تجربات مزے سے بیان کر جاتے تھے۔

جب اختر ریٹائر ہو گئے تو مالی حالت اور خراب ہو گئی۔ بہت دن سے انھیں انجمن میں بلانے
کا خیال تھا۔ عرش اور آزاد کو لکھا کہ انھیں آمادہ کریں۔ تیار ہو گئے۔ حضرت جوش ملسیانی کو خراج عقیدت
پیش کرنے کے لئے دسمبر ۱۹۵۵ء کے شروع میں جلسہ ہوا اس میں بڑی محبت سے ملے۔ تقریر بھی کی اور
کلام بھی سنایا۔ پھر جلد علی گڑھ آنے کا وعدہ کیا۔ بعد میں خط آیا کہ مالیر کوٹلے کے مشاعرے میں گیا تھا، بیمار
ہو گیا ہوں۔ نمونیا کا اثر تھا مگر نمونیا میرا کیا کر لیتی۔ چنانچہ اچھا ہو رہا ہوں۔ چند روز کے بعد آؤں گا۔
کچھ دن کے بعد میں دہلی گیا وہاں پہنچتے ہی خبر ملی کہ اختر کا انتقال ہو گیا۔ مشاعرے، انھیں لے ڈوبے۔
دل مسوس کر رہ گیا۔

ہری چند اختر جس نسل کے نمائندے تھے وہ اب ہماری آنکھوں کے سامنے رخصت ہو رہی ہے،
اس نسل میں ادب سے عشق تھا۔ اس کا فن کا شعور خاصا گہرا تھا۔ اس نے قدیم رنگ سے اپنا رشتہ قائم
رکھا تھا اور نئے رنگ کی حوصلہ افزائی کی تھی۔ یہ ہماری مشترک تہذیب کی بہترین خصوصیات کی علمبردار
تھی۔ اس میں وضعداری تھی، زندہ دلی تھی، خلوص تھا۔ ہمارے پُر آشوب دور نے اسے کچھ افسردہ
کر دیا تھا مگر یہ اس سے ہار ماننے والی نسل نہیں تھی۔ اردو ادب پر اس کا احسان بھلایا نہ جا سکے گا۔

مجھے خوشی ہے کہ محبی عرش ملسیانی کی کوشش سے اختر کے کلام کے بکھرے ہوئے اوراق
یکجا ہو گئے ہیں اور شائع ہو رہے ہیں۔ اختر ادب کو جو کچھ دے سکتے تھے اس سے کم شے پائے مگر جو
کچھ چھوڑ گئے ہیں اس کی آب و تاب بھی جلد ماند نہ ہو سکے گی۔

آل احمد سرور

۹۔ مارچ ۱۹۶۰ء

یادِ دوست

ستائیس اٹھائیس سال کی بات ہے اسلامیہ کالج لاہور کے پیچھے ایک تنگ گلی میں ایک سادہ سے مکان میں داخل ہوا تو پنڈت جی کو پہلی بار دیکھا۔ برآمدے کے فرش پر صرف ایک انگوچھا زیب تن کئے ایک چھوٹی سی بالٹی سامنے رکھے آم چوس رہے تھے۔ میں انھیں پہلی ہی نظر میں پہچان گیا وہ مجھے پہچان گئے۔ یوں محسوس ہوا جیسے برسوں کے شناسا ملے ہوں۔ "آؤ بیٹھو اور میرا ساتھ دو۔" یہ کہہ کر ایک میٹھا آم مجھے پیش کرتے ہوئے کہنے لگے۔ "سامان کہاں ہے کیا خالی ہاتھ آئے ہو؟" میں نے کہا "میں تو کل رات ہی آگیا تھا اور رام گلی میں ماسٹر جگت سنگھ صاحب کے یہاں ٹھہرا ہوں"۔ "اس تکلف کی کیا ضرورت تھی سیدھے یہاں چلے آتے" یہ کہہ کر پنڈت جی نے بے تکلفی کا آغاز کیا۔ والد کا مزاج پوچھا اور ساتھ ہی یہ تقاضا بھی کیا کہ سامان اٹھا لاؤ بچے لاہور سے باہر گئے ہوئے ہیں

خوب گزرے گی جو مل بیٹھیں گے دیوانے دو"

پنڈت جی سے میری پہلی ملاقات کی یہ تفصیل ہے۔ اس کے بعد زندگی کی ایک طویل مدت ان کی رفاقت میں گزری۔ ان کی شرافتِ نفس کے صدقے میں "سگ باش برادر خورد مباش" کے مفہوم سے آشنا ہوتے ہوئے خود کو ان کا برادرِ عزیز نہیں بلکہ

برادرِ خورد محمد کرنی ذرّتا تخلص اختر تھا۔ ذہانت اور علم کے آسمان کے وہ آفتاب تھے۔ لوگ انہیں اختر صاحب کہتے تھے۔ کچھ نام کی قید لگا کر ہری چند اختر کہتے۔ ہم سب، میں اور اُن کے دوسرے خاص احباب، انھیں محض پنڈت جی کہتے۔ اسی محبوب نام سے انھیں اب بھی یاد کرتے ہیں۔

یکم جنوری ۱۹۵۸ء کی شب کو وہ عالمِ بقا کو سدھار گئے۔ مالیر کوٹلہ کے مشاعرے میں ۱۵۔ دسمبر کو میرے ساتھ گئے تھے۔ واپسی پر انفلوئنزا اور نمونیا کا شکار ہو گئے۔ یہاں تک تو میں نے بھی اُن کا ساتھ دیا۔ وہ صحت یاب ہو گئے، یہ خبر مجھے ۳۱۔ دسمبر کو ایک دوست نے دی جب میں ان سے ملنے کے لئے جا رہا تھا۔ دوست نے مجھے روک لیا اور کہا "پنڈت جی مکان پر نہیں ہوں گے۔" میں رُک گیا اور اُن کے دیدار سے محروم رہ گیا۔

۲ جنوری کی صبح کو ۸ بجے کے قریب کسی نے دروازہ کھٹکھٹایا۔ اندر آیا تو ایک نوجوان جسے میں جانتا بھی نہیں تھا کہنے لگا "میں اختر صاحب کے مکان سے آیا ہوں" میرا ماتھا ٹھنکا۔ میں نے سوچا پنڈت جی عام حالات میں اپنا دکھ درد کسی کو نہیں بتلاتے ضرور کوئی غیر معمولی بات ہوگی لیکن اندازہ صرف یہیں تک تھا کہ وہ شدید بیمار ہوں گے محض ایک دو سیکنڈ کے وقفے کے بعد اس نوجوان نے کہا "کل رات ان کا انتقال ہو گیا۔" میں یقین نہ کر سکا۔ لحاف سے باہر نکلا اور اس پیامبر سے معذرت کے ساتھ صرف اتنا کہا کہ چلئے میں جلد پہونچتا ہوں۔ مکان پر گیا تو ایک کہرام مچا ہوا تھا۔ بچے بلک بلک کر رو رہے تھے۔ مجھ سے لپٹ کر کہنے لگے "چاچا جی! بابو جی کو بلائیے وہ بولتے نہیں آپ بلائیں گے تو وہ ضرور بولیں گے۔"

آنکھوں سے آنسوؤں کا سیلاب بہنے لگا ان کے قدموں کی طرف بڑھا، آخری سجدہ کیا اور صحن میں ان کے چاہنے والوں کا انتظار کرنے لگا۔ دس بجے کے بعد جنازہ اٹھا تو بے اختیار زبان سے نکلا "خاموش ہو گیا ہے چمن بولتا ہوا" جس کو بھی خبر ہوئی وہ پہونچا کوئی مکان پر، کوئی شمشان کے راستے میں اور کوئی شمشان پر۔ لاہور کی ادبی فضاؤں کا درخشندہ ستارہ، دلّی کی محفلوں کا صدر اپنے آخری سفر پر تھا۔ آخری رسوم ادا کر کے سب لوگ اپنے اپنے گھروں کو چلے گئے۔ دوارکا داس شعلہ، مہندر سنگھ بیدی، راجندر لال اختر، خوشتر گرامی، رنبیر، پرشوتم لال ضیا، جگن ناتھ آزاد، تلوک چند محروم، شمشیر سنگھ نرولا، ملکھی رام اور کتنے ہی ادب نواز، ادب دوست اور ادب پرور اس جسم کو نذرِ آتش کرنے کے لئے جمع ہوئے تھے جسے اگر ذرا سی آنچ بھی لگتی تو یہ لوگ بلبلا اٹھتے۔

قدردانِ کمال اس دنیا میں ملتے نہیں تو صاحبِ کمال بھی کیوں رہیں۔ ہری چند اختر بڑے بھائی، شفیق دوست حتّیٰ کہ مرشد بھی کہہ دوں تو مبالغہ نہیں اس دارِ فانی سے چل دئے ایک دائمی سکون کی تلاش میں، اس ناہنجار دنیا کی آلائشوں سے دور، ناقدریٔ علم سے تنگ آکر نہیں بلکہ اس پر ایک حقارت آمیز نظر کرتے ہوئے

ناؤ کو اک ساحل تو ملا طوفانوں سے چین تو ہے
موت ہے اچھا موت ہی میں اس گھاٹ اترتا ہوں

اس دور میں شرافتِ نفس کا قحط ہے وہ شرافتِ نفس کا پیکر تھے۔ اس دور میں علم وفن کی کمی ہے وہ علم وفن کے اعتبار سے صاحبِ کمال تھے۔ اس دور میں تملق اور خوشامد کا بازار گرم ہے وہ خوددار اور غیور تھے اس حد تک خوددار اور غیور تھے کہ خود اپنے قول کے مطابق ؎

نویدِ سربلندی دی ہُنر نے تو ہیں سمجھا
سگانِ دہر کے آگے دُم ہلانے کا وقت آیا

جس کو دیکھتا ہوں ان کے لطیفوں کو روتا ہے۔ ان کی بھرپور شخصیت میں صرف بذلہ سنجی ہی کے پہلو کو دیکھتا ہے۔ کم استعداد کے لوگوں کو وہ لطافت سے خوش کر دیا کرتے تھے۔ ان کی شخصیت کو صرف لطیفوں تک محدود کرنا ان سے ظلم اور اپنی عقل کا ماتم کرنا ہے علم و فضل کے اعتبار سے ان کا مرتبہ بہت اونچا تھا۔ وہ ایک چلتا پھرتا انسائیکلو پیڈیا تھے۔ نظم و نثر پر یکساں قدرت تھی۔ ہر ذہین آدمی سہل انگار ہوتا ہے، وہ ضرورت سے زیادہ ذہین تھے اس لئے ان کی سہل انگاری عیب کی حد تک بڑھی ہوئی تھی۔ انھوں نے نظم و نثر کی صورت میں اتنا کچھ لکھا لیکن ایک بھی مجموعہ ان کی زندگی میں شائع نہ ہوا۔ اب بھی ان اوراقِ پریشاں کو جمع کرنا ہفت خواں طے کرنے کے برابر ہے۔ میں نے ان سے بارہا تقاضا کیا کہ مجموعہ مرتب کریں۔ جس بات کے لئے میں زیادہ تقاضا کرتا وہ اسے میرے ذمے لگا دیتے۔ ان کی کچھ غزلیں میں نے جمع کی تھیں وہ محفوظ ہیں لیکن بہت سا کلام ادھر دوستوں کے پاس محفوظ ہوگا۔

ان کے علمی تبحر اور حیرت انگیز قوتِ تجزیہ سے متعلق ایک واقعہ عرض کرتا ہوں۔ والد کا مجموعۂ کلام 'جنون و ہوش' مرتب ہوا تو میں نے پنڈت جی سے کہا کہ دیباچہ یا مقدمہ کون لکھے گا۔ ہندوستان و پاکستان کے ادیبوں اور نقادوں کے کتنے ہی نام انھوں نے لئے میں انکار کرتا چلا گیا۔ گھبرا کے کہنے لگے تو پھر خود ہی لکھ ڈالو۔ میں نے کہا اس سے بھی نزدیک کی بات کرتا ہوں یہ مقدمہ آپ کو لکھنا ہے۔ کرسی سے اچھل پڑے اور کہنے لگے اس سعادت کا میں واحد مستحق ہوں اس کا مجھے علم نہ تھا۔ مسودہ لے گئے لیکن تین چار

ماہ بیت وصل میں گزر گئے ہیں۔ ان کی غیر حاضری میں ان کے مکان سے مسودہ لے آیا۔ دوسرے دن پورے دس بجے وہ بیرسٹر صاحب دفتر میں موجود تھے۔ اُن کے تیور کہہ رہے تھے کہ میری اس جسارت سے انھیں دکھ پہنچا ہے۔ ذرا سرزنش آمیز لہجے میں مجھ سے کہنے لگے مسودہ کیوں اٹھا لائے مجھے تو کل رات مقدمہ لکھنا تھا۔ مسودہ ہی وہاں موجود نہ تھا میں نے کہا مسودہ حاضر ہے۔ آپ بیٹھ جائیے اور لکھ ڈالیے۔ میں کمرے سے نکل گیا چار بجے کے قریب گیا دیکھتا ہوں کہ ۵۰ صفحے کا مقدمہ وہ لکھ چکے تھے اور مقدمہ بھی وہ جو اردو نثر اور مقدمہ نگاری کی تاریخ میں ہمیشہ یادگار رہے گا۔

انھوں نے ستاون برس تک قریب عمر پائی۔ ہوشیار پور کے ضلع کا ایک غیر معروف قصبہ 'صاحیا' ان کا مولد تھا۔ ان کے خاندان میں ادیب تو کجا معمولی علم سے شناسا بھی کوئی صاحب نہ تھے۔ یہ خدا کی دین تھی کہ وہ اس غیر معروف خاندان اور غیر معروف گاؤں کے فرد ہوتے ہوئے علم و ادب کی دنیا میں پائیدار شہرت کے مالک ہوئے۔ جالندھر کے گورنمنٹ ہائی اسکول میں زیر تعلیم تھے کہ حفیظ جالندھری سے ملاقات ہوئی۔ شعر کا شوق تھا انھیں کے شاگرد ہوئے۔ یہ ہم عمر استاد اور شاگرد اسی زمانے سے یک جان دو قالب ہوئے۔ یہ رفاقت ٹوٹی تو ایک کی موت سے۔ جالندھر سے فارغ التحصیل ہو کر پنڈت جی لاہور فارمن کرسچن کالج میں داخل ہو گئے۔ شروع شروع میں 'شرما' تخلص کرتے تھے۔ حفیظ صاحب کے مشورے سے اختر تخلص رکھا۔ ذہین اور طباع تھے گرامی مرحوم کی صحبتوں سے جالندھر میں فیض یاب ہوتے رہے۔ کالج کے میگزین کے ایڈیٹر تھے۔ طنز و مزاح فطرت میں تھا "دوزخی" تخلص سے بہت ہی نادر نظمیں تصنیف کیں۔ اخبارات میں کلام چھپنے لگا۔ لاہور ایس پی ایس کے ہال کے ہنگامہ خیز

پھبتیاں کہتے۔ ع روٹی تو کسی طور کما کھائے مچھندر۔ پرانے لوگ زبان میں کچھ سناتے تو پنڈت جی زبان سے ارشاد فرماتے اور زبان کی قلابازیوں کا مذاق پیروڈی سے اڑاتے ـــــ

کہا کابل چلے جائیں، کہا کابل چلے جاؤ

کہا افغان کا ڈر ہے، کہا افغان تو ہوگا

کہا ہم چین ہو آئیں، کہا تم چین ہو آؤ

کہا جاپان کا ڈر ہے، کہا جاپان تو ہوگا

پنڈت جی مشاعرے میں ہمیشہ ایک گوشے میں بیٹھتے۔ احباب کا مجمع ان کے گرد ہوتا۔ ہر شعر پر تبصرہ ہوتا اور وہ وہ نکات نکلتے کہ مشاعرے کا یہ گوشہ زعفران زار بن جاتا ایک بزرگ اور کہنہ مشق شاعر غزل پڑھ رہے تھے 'بات کتنی' 'رات کتنی' زمین تھی انھوں نے پہلا مصرع پڑھا ع

یہ دل ہے یہ جگر ہے یہ کلیجا

پنڈت جی بھلا کب چوکنے والے تھے فوراً مصرع دیا اور بلند آواز سے پڑھا

قسائی دے گیا سوغات کتنی

محفل میں قہقہے پر قہقہہ بلند ہوا۔

رام رچھپال سنگھ شیدا کا کمل، راج نرائن ارمان کی مونچھیں، تاجور نجیب آبادی کی توند، حسن نظامی کی تبلیغ، ظفر علی خاں کے آریا، کا پیشہ غفلت پنڈت جی کس کس بات کو ستم ظریف دوزخی نے موضوعِ سخن نہیں بنایا۔ ظفر علی خاں سے نوک جھونک ہو رہی تھی کہیں ان کے شعر میں تعقید نظر آئی پوری نظم صنعتِ تعقید میں کہہ ڈالی۔

پھر ظفر کے بعد گائے ایسے ڈھوسے کون گا   پھر سنائے مظرِیاں پیٹے جو بولے کون گا

اقربت مرحوم کی جیبیں ٹٹولے کون گا   بھر کے لے جائے جو نہیں جیب کے جھولے کون گا

نبض تک خاموش رہ جاتی ہے رعبِ حسن سے   حالِ دل پوچھا اگر اس نے تو بولے کون گا

تو تو مجھ پر کر رہا ہے بے خبر مشقِ کلورخ   چنوں کے تیرے واسطے لائے غلولے کون گا

ہے شبِ وعدہ ادھر مجھ پر ہے غلبہ نیند کا   وہ اگر آئے تو پھر دروازہ کھولے کون گا

دوزخی صاحب بھی ساحل سے جھٹ بیٹھے اگے

عشق کے طوفان میں کھائے جھکولے کون گا

پیر دوزخی کی طرف دو مثالوں پر اکتفا کرتا ہوں

یہ ہے بوتل کے دام کر ساقی رات گزرنے والی ہے

اور یہ تیرا انعام کر ساقی رات گزرنے والی ہے

شعر میرا ہے مثلِ سندھ عمیق   اور روانی چناب کی سی ہے

دلِ خانہ خراب کی صورت   دلِ خانہ خراب کی سی ہے

گرمیٔ عشق یعنی گرمیٔ عشق   جون کے آفتاب کی سی ہے

اک طرف پاؤں اک طرف جوتا   میری حالت جراب کی سی ہے

شیخ جی دوزخی ملے تھے آج   شکل بالکل جناب کی سی ہے

صحیح ذوقِ مزاح اس کو کہتے ہیں کہ آپ پر خود ضرب پڑے تو آپ بوکھلائیں نہیں خود اپنے نام کے دو لطیفے وہ خود ہی مزے لے لے کر بیان کیا کرتے تھے ۔ لاہور ریڈیو میں ملازم تھے ۔ لنچ کا وقت تھا کسی محترمہ نے ٹیلی فون کیا ۔ پنڈت جی نے محترمہ سے

کہا کہ متعلقہ صاحب کو وہ ان کا پیغام پہونچا دیں گے کیونکہ وہ ابھی موجود نہیں باہر گئے ہیں۔ محترمہ نے ٹیلیفون پر پوچھا آپ کا اسم گرامی؟ آپ نے جواب دیا ہری چند اختر۔ محترمہ نے کہا ہری چند...... آپ نے فرمایا اختر۔ محترمہ نے کہا سبحان اللہ کیا نام ہے ہری چند اختر۔ یہ تو وہی بات ہوئی ممتاز شانتی۔

دوسرا لطیفہ یہ ہے کہ ان کے ایک پاکستانی دوست نے کہا پنڈت جی ہمیں عزیز کیوں نہ ہوں ان کا نام نامی تو ہمارا قومی جھنڈا ہے۔ ہری چند اختر سبز رنگ اور چاند تارا۔

گرامی، اقبال، سر عبدالقادر، ظفر علی خاں، راجہ نریندر ناتھ، رائے بہادر کنورسین کی صحبتوں میں شامل رہے۔ گرامی پر ایک دلچسپ مضمون آپ کے قلم سے "آج کل" کے صفحات کی زینت بن چکا ہے۔ اقبال کی محفلوں کے بہت سے قصے ہم نے ان سے سنے۔ صرف ایک قصہ یاد رہ گیا ہے۔ نیاز محمد لاہور ہائی کورٹ کے ایک مشہور وکیل تھے۔ ایک ٹانگ شانِ تیموری کی حامل تھی۔ ایک دن ایک فارسی غزل "مُرخ یا لاکن کہ ارزانی ہنوز" کے مصرع پر کہہ کر لائے، علامہ اقبال کو سنائی۔ وہ سنتے رہے اور آخر میں ایک فی البدیہہ شعر سے داد دی ؎

گرچہ در قانوں فلک پیما شدی   بر زمینِ شعر لنگانی ہنوز

قاضی فضل الحق گورنمنٹ کالج میں پروفیسر تھے۔ انھیں خان صاحب کا خطاب ملا۔ صوفی غلام مصطفےٰ لکچرر تھے۔ صوفی صاحب نے اس موقع پر ایک منظوم نظر گرداں اختر گرداں کی زمین میں سنائی۔ پنڈت جی نے برجستہ ایک دعائیہ شعر کہا ؎

قاضیٔ ماراخاں بہادر کن　　　صوفی رالچھار تز گرداں

جموں کے مشاعرے میں شامل ہونے کے لئے شعراء کی کیمپ لاہور سے ریل میں سوار تھی تو پنڈت دتّاتریہ پرشاد فدا نے (افسوس حال ہی میں آپ کا بھی دہلی میں انتقال ہو گیا) اختر صاحب سے کہا کہ غزل تو کہہ لی ہے مقطع نہیں ہوا۔ زمین تھی فدا ہو کر، دُعا ہو کر۔ اختر صاحب نے کہا لیجئے مقطع حاضر ہے

مزا جینے کا آخر دل لگانے پر ہی ملتا ہے
فدا صاحب کسی پر دیکھ لینا تم فدا ہو کر

فدا صاحب بڑے متین اور ثقہ آدمی تھے۔ احباب نے یہ مقطع سُنا تو ریل کا ڈبہ ایک فرمائشی قہقہے سے گونج اٹھا۔ علمی مباحث میں خواہ مخواہ کو چھیڑنا اختر صاحب کی فطرت تھی۔ بذلہ سنجی کا کوئی موقع ملتا تو چوکتے نہیں تھے۔ علم و فن کی بصیرت کے لحاظ سے بڑے بھاری بھرکم انسان تھے لیکن ان کی ذاتی شرافت اور انکسار کے قصے اگر لکھنے بیٹھوں تو پوری کتاب ہو جائے۔ وہ یاروں کے یار، بڑے ملنسار اور ہر جہت سے بلند مرتبہ آدمی تھے۔ تمام عمر دوستوں کی خدمت کرتے رہے۔ خود تنگ دست رہے لیکن دوستوں کی تنگ دستی دیکھ نہ سکتے تھے۔ دفتر سے گھر تک آتے آتے آدھی تنخواہ بانٹ دیتے، قرضہ لے کر احباب کی مشکل کشائی کرتے۔ ان کے خاندان میں بیواؤں اور یتیموں کی بڑی تعداد تھی۔ جب کبھی وطن جاتے جیب میں جو کچھ ہوتا تقسیم کر دیتے صرف ریل کا کرایہ بچ جاتا۔ اس سلسلے میں بعض "دوستوں" نے ان کی اس شرافت سے ناجائز فائدہ بھی اٹھایا اور وقت آنے پر کبھی اُن کی بات نہ پوچھی۔ غالباً اسی سے متاثر ہو کر انھوں نے یہ غیر فانی شعر کہا ہوگا ؎

ہمیں بھی آ پڑا ہے دوستوں سے کام کچھ یعنی　　　ہمارے دوستوں کے بے وفا ہونے کا وقت آیا

۱۹۴۳ء میں جوان بیٹے کا انتقال ہوا۔ دوسرے یا تیسرے دن ہی احباب کی محفل میں شامل تھے۔ ایسا صابر اور قانع انسان میں نے دیکھا ہی نہیں۔ معاش کی خاطر انھوں نے کبھی بڑے لوگوں کے آستانوں پر سر نہیں جھکایا۔ ایک دن جناب جوشؔ ملیح آبادی نے میری موجودگی میں ان سے کہا کہ اخترؔ صاحب آپ کی معاشی بہتری ہو بھی تو کس طرح آپ تو اتنے کاہل اور مستغنی ہیں کہ جس سے آج ملنے کی ضرورت ہے آپ اس سے مہینوں بعد ملیں گے۔ فرمانے لگے "جوشؔ صاحب واقعہ یہ ہے کہ میں عرشؔ کے کہنے کے سوا کسی اور کے کہنے پر کسی آستانے پر سجدہ کرنے نہیں جاتا۔ لیکن جب اس کے کہنے پر چلا جاتا ہوں اور جن کے پاس جاتا ہوں وہ مکان پر نہیں ملتے تو بڑی راحت نصیب ہوتی ہے..." یہ تھی ان کی شانِ استغناء۔

ایک دن خلافِ توقع مجھ سے ملنے کے لئے آئے۔ میں نے کہا کہئے کیا ارشاد ہے کہنے لگے "سو روپیہ لاؤ فوری ضرورت آپڑی ہے۔ میں نے تذبذب کا اظہار کیا۔ سو روپے دینے کے خیال سے نہیں بلکہ اس خیال سے کہ یہ سو روپے بھی 'خیرات' ہونے والے ہیں میں نے کہا۔ پنڈت جی مجھے اور بھابی کو یہی شکایت ہے کہ آخر آپ کرتے کیا ہیں۔ بچوں کے لقمے چھین کر دوستوں کو دیتے ہیں یہ واجب نہیں۔ انھیں یہ 'تنقید' اچھی نہ لگی۔ ذرا آزردہ خاطر ہو کر کہنے لگے تم دونوں مجھ سے جواب طلب نہیں کر سکتے"۔ میری بداعمالی دیکھو تو مجھے گردن زدنی قرار دے سکتے ہو۔ اتنا کہا اور جیب سے سو سو روپے کے پانچ نوٹ نکال کر کہنے لگے کہ بس ایک نوٹ کا اضافہ اور کردو۔ ایک دوست کی جان آج چھ سو میں بچتی ہے۔ میں دیکھتا رہ گیا۔ دل ہی دل میں میں نے ان کے قدموں پر سر جھکایا اور سو روپے ان کی نذر کئے۔ خوش خوش گئے اور کہنے لگے کہ بہت جلد یہ سو روپے

واپس کر دوں گا۔ چناں چہ ایسا ہی ہوا۔ یہ عظیم المرتبت انسان قرض لے کر دوستوں کی مدد کرتا تھا۔

راشننگ کا زمانہ تھا کپڑا ملتا نہیں تھا۔ ایک عقیدت مند سفید ٹوئل کا تھان لایا اور پنڈت جی کو دے گیا۔ وہ تھان دفتر میں میز پر پڑا تھا کہ ان کے دوست، ماتحت حتیٰ کہ چپڑاسی تک آئے اور ایک ایک دو دو قمیص کا کپڑا ان سے لے گئے۔ ان کے لئے ایک دھجی بھی زخم پر پٹی باندھنے کے لئے نہ بچی۔ طرہ یہ کہ انھیں یہ تھان تحفتاً ملا تھا اور "مالِ مفت" کی حیثیت سے تقسیم ہوا۔ ایسے سیکڑوں قصے ہیں کس کس کو بیان کروں۔

حرفِ شکایت کبھی زبان پر نہیں آیا اور آیا بھی تو بڑے رکھ رکھاؤ سے۔ خود ہی فرماتے ہیں

کہیں افراطِ مے ہے چہرہ افروز　　کہیں خونِ جگر باقی نہیں ہے
مجالِ دم زدن کس کو ہے یارب　　مگر یہ شانِ رزاقی نہیں ہے

درد سے کراہتے منہ سے ہائے نکلنے کو ہوتی کسی بچے کو کمرے کی طرف آتے دیکھتے تو اس ہائے کو پی جاتے مبادا بچوں کو رنج ہو۔ آنکھوں کی بینائی جاتی رہی بچوں کو اس کا علم تک نہ ہوا۔ دوار کا داس شعلہ کو بلوایا اور کہا کہ میری آنکھوں میں کچھ تکلیف ہے۔ آنکھیں بند کر لیتا ہوں تو راحت ہوتی ہے اس لئے میرا ہاتھ پکڑو اور مجھے ڈاکٹر کول کے پاس لے چلو۔ خوش قسمتی سے آپریشن کامیاب ہو گیا اور ایک آنکھ کی بینائی واپس آ گئی۔ ان کے بچوں کو تا دمِ مرگ یہ علم نہیں تھا کہ ایک آنکھ کی بینائی جاتی رہی تھی۔

بیس مہینے سے پنشن پر تھے۔ ابھی پنشن ملنا شروع نہیں ہوئی تھی۔ میں نے ایک دن پوچھا پنڈت جی کیسا سلسلہ ہے، گزر کیسے ہو رہی ہے؟ کہنے لگے شکر ہے بہت اچھی

گزر رہی ہے۔ ان کے انتقال کے بعد مجھے اندازہ ہوا کہ اس 'اچھی گزر رہی ہے' کا مفہوم کیا تھا۔ ان کے انتقال پر ہندوستان اور پاکستان میں بڑا ماتم ہوا۔ اخباروں میں مضمون لکھے گئے، جلسے بھی ہوئے، مرثیے بھی موزوں ہوئے، قطعاتِ تاریخ کی بھی بھرمار ہوئی۔ لیکن اس سے کیا ہوتا ہے۔ ضرورت ان پانچ معصوم کلیوں کی نگہداشت کی تھی جنھیں یہ غافل و مستغنی مالی ہم لوگوں کے رحم و کرم پر چھوڑ گیا۔ اللہ کا شکر ہے کہ دوستوں نے اس ضرورت کو محسوس کیا اور اب حالات اتنے مایوس کن نہیں رہے۔ وہ پانچ بچوں اور ایک بیوہ کو خدا کے حوالے کر کے چلے گئے، اس خدا کے حوالے جس کے باب میں انھوں نے کہا تھا ؎

تو مرے اعمال کا پابند نکلا حشر میں
اے خدا میرے خدا تجھ کو خدا سمجھا تھا میں

پنڈت جی چلے گئے، اس دنیا میں جہاں ہم سب کو پہونچنا ہے۔ وہ یارانِ تیز گام میں سے تھے ہمیں جرسِ کارواں کے نالوں کے رحم پر چھوڑ گئے۔ اس دنیا کو انھوں نے جس انداز سے دیکھا اس کے پیشِ نظر عالمِ بالا سے یہی شعر سنا رہے ہیں ؎

السلام اے بعدِ ما آہستہ رگان رفتنی
بر شما خوش باد نا خوش ہائے دنیائے دنی

گزارشِ مؤلف

پنڈت ہری چند اختر ناگہاں طور پر یکم جنوری ۱۹۵۸ء کو انتقال فرماگئے۔ ان کے انتقال کے بعد سب سے پہلی ضرورت یہ تھی کہ ان کے بچّوں کی نگہداشت ہو۔ ان کے احباب نے اس عظیم کام کو اپنے ذمہ لیا اور خدا کے فضل سے حالات تسلّی بخش ہیں۔ اس سلسلے میں سب سے زیادہ شکریے کے مستحق پنڈت جی کے حبیب لبیب مسٹر ممتاز حسن صاحب سابق سکرٹری فنانس حکومت پاکستان ہیں۔ ان کے ساتھ ہی بخشی غلام محمد صاحب وزیر اعظم ریاست جموں و کشمیر، کنور مہندر سنگھ بیدی، دوارکا داس شعلہ، راجندر تلی اور دوسرے احباب کی کثیر تعداد ہے جنھوں نے اس کارِ خیر میں حصّہ لیا

پنڈت جی کا کلام اِدھر اُدھر منتشر پڑا تھا۔ وہ اپنی ذات سے اس قدر غافل تھے کہ کلام بھی یک جا نہیں کیا۔ اس مجموعے میں جو کچھ شامل کیا جا رہا ہے وہ منتشر اوراق، احباب یا اخبارات وغیرہ سے جمع کیا ہے۔ بہت سا کلام ابھی ہاتھ نہیں لگا۔ احباب سے گزارش ہے کہ پنڈت جی کا جس قدر کلام اس کتاب میں مطبوعہ کلام کے علاوہ ان کے پاس ہو مؤلف کو عنایت فرمائیں تاکہ اسے اگلے ایڈیشن میں شامل کیا جا سکے۔

پنڈت جی ایک پختہ کار شاعر تھے - اس کلام میں اگر کہیں کوئی سقم نظر آئے تو اس کی ذمہ داری ان پر عائد نہیں ہوتی بلکہ اسے مؤلف کی کوتاہی پر محمول فرمانا چاہیئے - کلام جب ادھر اُدھر سے حاصل کیا جاتا ہے تو اس قسم کی باتیں ناگزیر ہو جاتی ہیں -

عرشؔ ملسیانی
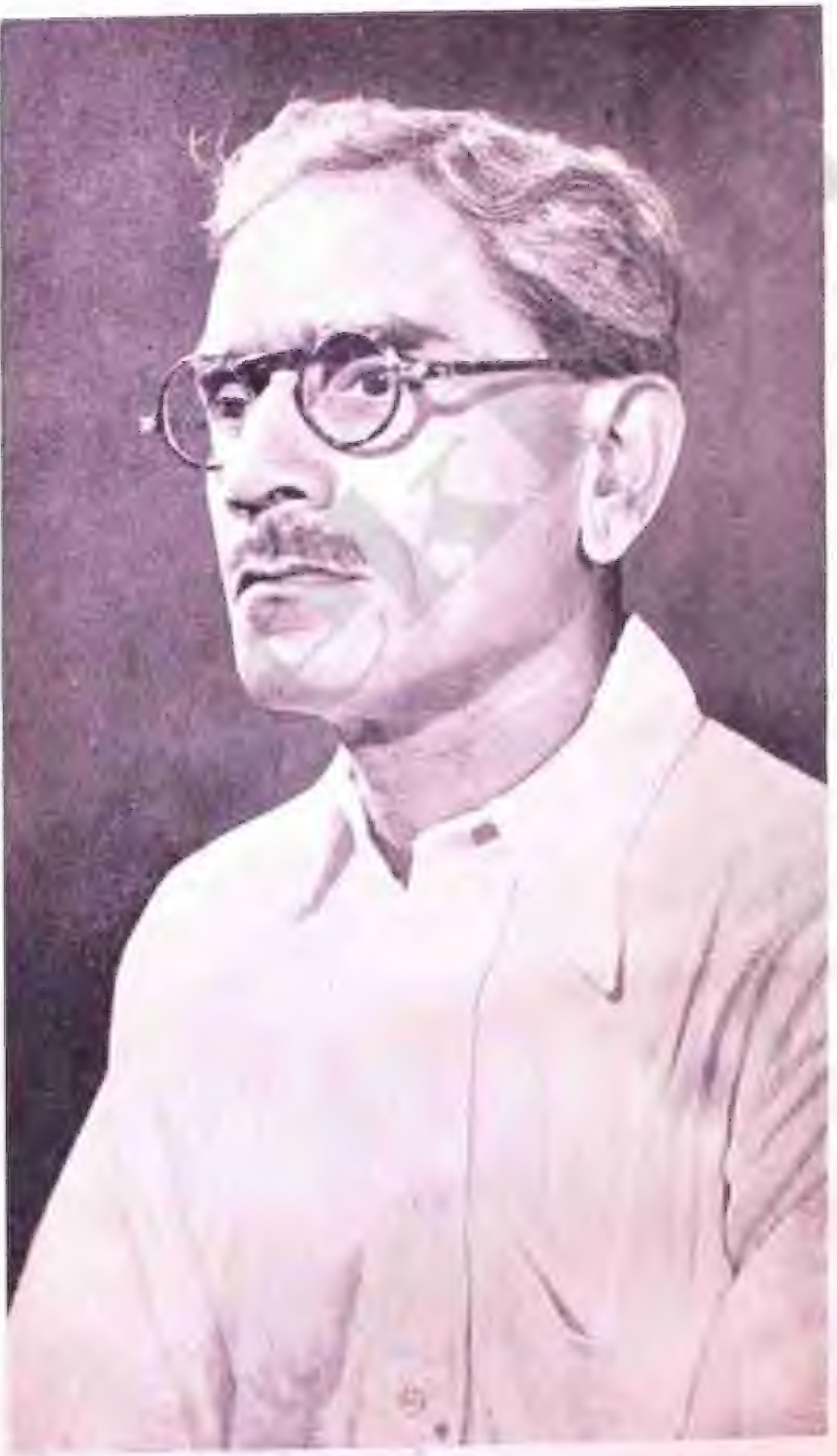
پریم چند اختر

کفر و ایماں

وُہ اچھے کٹے یا بُرے کٹ گئے

بہم مل کے دو دِن گزارے تو تھے

دِلوں میں بھی فرق آ گیا تھا تو کیا

نگاہوں کو حاصل نظارے تو تھے

بُرا جانتے تھے تو پھر کیا ہُوا

بُرے ہی سہی ہم تمھارے تو تھے

شباب آیا کسی بُت پر فدا ہونے کا وقت آیا

مری دُنیا میں بندے کے خدا ہونے کا وقت آیا

اُنھیں دیکھا تو زاہد نے کہا ایمان کی یہ ہے

کہ اب انسان کے سجدا روا ہونے کا وقت آیا

تکلّم کی خموشی کہہ رہی ہے حرفِ مطلب سے

کہ اشک آمیز نظروں سے ادا ہونے کا وقت آیا

خدا جانے یہ ہے اَوجِ یقیں یا پستیٔ ہمّت

خدا سے کہہ رہا ہوں ناخُدا ہونے کا وقت آیا

ہمیں بھی آپڑا ہے دوستوں سے کام کچھ یعنی

ہمارے دوستوں کے بے وفا ہونے کا وقت آیا

نویدِ سربلندی دی منجّم نے تو میں سمجھا

سگانِ دہر کے آگے دوتا ہونے کا وقت آیا

ذہن رہنِ قومیت احساس محبوسِ وطن

وائے نادانی قفس کو آشیاں سمجھا تھا میں

ہاتھ شل ہوتے رہے پھر بھی دعا اٹھتے رہے

تیری بے مہری کو اپنا امتحاں سمجھا تھا میں

سستیٔ ایماں کا کچھ باعث ہے ورنہ ایک دن

آتشِ نمرود کو بھی گلستاں سمجھا تھا میں

آہ سوداگر ہی نکلے وہ دوست بھی آخر جنہیں

بے نیازِ کاوشِ سود و زیاں سمجھا تھا میں

تو مرے اعمال کا پابند نکلا حشر میں

اے خدا میرے خدا! تجھ کو خدا سمجھا تھا میں

سیرِ دنیا سے غرض تھی محوِ دنیا کر دیا

میں نے کیا چاہا مرے اللہ نے کیا کر دیا

آرزو کی پُر سکوں بستی میں ہلچل ڈال دی

اک نگہ سے تو نے دل میں حشر برپا کر دیا

روکنے والا نہ تھا کوئی خدا کو اس لئے

جو کچھ آیا اس کے جی میں بے محابا کر دیا

ہاں اسی کم بخت دل نے کر دیا افشائے راز

ہاں اسی کم بخت دل نے مجھ کو رسوا کر دیا

عشق جا، ان تیری باتوں میں نہیں آنے کے ہم

اچھے اچھوں کو جہاں میں تو نے رسوا کر دیا

زندگی بیٹھی تھی اپنے حسن پہ بھولی ہوئی

موت نے آتے ہی سارا رنگ پھیکا کر دیا

حُسن نے پہلے تو سب مجھ پر حقیقت کھول دی

اور پھر خاموش رہنے کا اشارا کر دیا

زندگی کے دوش پر اک بوجھ تھا بارِ اُمید

مرحبا اے یاس تو نے بوجھ ہلکا کر دیا

حُسن کو پہنا چکے جب خود نمائی کا لباس

عشق نے سر پیٹ کر پوچھا کہ یہ کیسا کر دیا

ابھی تو یہی دیکھنا چاہتا ہوں

نہیں چاہتا اُن کو یا چاہتا ہوں

وہ کہتے ہیں تم مجھ سے کیا چاہتے ہو

یہی کچھ تو میں جاننا چاہتا ہوں

مری نیتوں پر نظر رکھنے والو!

خُدارا بتا دو میں کیا چاہتا ہوں

نہ سمجھا کوئی جس کو وہ حرف ہوں میں

غلط ہو گیا ہوں مٹنا چاہتا ہوں

وہ پُر جوش آنسو وہ خاموش آہیں

وہی عشق کی ابتدا چاہتا ہوں

میں سمجھا وہ کچھ پوچھنا چاہتے ہیں

وہ سمجھے کہ میں کچھ کہا چاہتا ہوں

اُمیدوں سے دلِ برباد کو آباد کرتا ہوں

مٹانے کے لئے دُنیا نئی ایجاد کرتا ہوں

تری میعادِ غم پوری ہوئی اے زندگی خوش ہو

قفس ٹوٹے نہ ٹوٹے میں تجھے آزاد کرتا ہوں

جفاکارو مری مظلوم خاموشی پہ ہنستے ہو

ذرا ٹھہرو، ذرا دم لو ابھی فریاد کرتا ہوں

میں اپنے دل کا مالک ہوں مرا دل ایک بستی ہے

کبھی آباد کرتا ہوں، کبھی برباد کرتا ہوں

ملاقاتیں بھی ہوتی ہیں ملاقاتوں کے بعد اکثر

وہ مجھ کو بھول جاتے ہیں میں اُن کو یاد کرتا ہوں

خودی کی ابتدا یہ تھی کہ اپنے آپ میں گم تھا

خودی کی انتہا یہ ہے خدا کو یاد کرتا ہوں

بتوں کے عشق میں کھویا گیا ہوں ورنہ اے اخترؔ

خدا شاہد ہے میں اکثر خدا کو یاد کرتا ہوں

شیخ و پنڈت دھرم اور اسلام کی باتیں کریں

کچھ خدا کے قہر کچھ انعام کی باتیں کریں

یہ سنائیں پاک نغمے اوّلیں الہام کے

وہ خدا کے آخری پیغام کی باتیں کریں

ہم کھڑے سنتے رہیں اور دل میں یہ کہتے رہیں

اب یہ رخصت ہوں تو ہم کچھ کام کی باتیں کریں

یاس و حرمان و غم و آلام کی باتیں کریں

آ دلِ ایذا طلب کچھ کام کی باتیں کریں

دوست سے کہہ دیں دلِ بے مدعا کی داستاں

آج ساقی سے شکستِ جام کی باتیں کریں

جس کی دُنیا آپ سے تھی جس کی دُنیا آپ تھے

آؤ اُس بدبخت کے انجام کی باتیں کریں

عمر بھر کا عہدِ اُلفت اک خیالِ خام تھا

آؤ لیکن اس خیالِ خام کی باتیں کریں

زندگی بے شک ترا انعام ہے یارب مگر

سُن سکے تو کچھ ترے انعام کی باتیں کریں

لب پہ ہی کبھی آ نہ سکا نام تمہارا

دل نے تو کئی بار، کئی بار پکارا

اک بار جو مل جائیں وہ بچھڑے ہوئے لمحے

سو بار ہے مجھے تلخئ ایام گوارا

جہاں تجھ کو بٹھا کر پوجتے ہیں پوجنے والے

وہ مندر اور ہوتے ہیں شوالے اور ہوتے ہیں

دہانِ زخم سے کہتے ہیں جس کو مرحبا بسمل

وہ خنجر اور ہوتے ہیں وہ بھالے اور ہوتے ہیں

جنھیں محرومیٔ تاثیر ہی اصلِ تمنّا ہے

وہ آہیں اور ہوتی ہیں وہ نالے اور ہوتے ہیں

جنھیں حاصل ہے تیرا قرب خوش قسمت سہی لیکن

تری حسرت لیے مرجانے والے اور ہوتے ہیں

جو ٹھوکر ہی نہیں کھاتے وہ سب کچھ ہیں مگر واعظ!

وہ جن کو دستِ رحمت خود سنبھالے اور ہوتے ہیں

تلاشِ شمع سے پیدا ہے سوزِ ناتمام اختر

خود اپنی آگ میں جل جانے والے اور ہوتے ہیں

جس زمیں پر ترا نقشِ کفِ پا ہوتا ہے

ایک اِک ذرّہ وہاں قبلہ نُما ہوتا ہے

کاش وہ دل پہ رکھے ہاتھ اور اتنا پوچھے

کیوں تڑپ اٹھتا ہے کیا بات ہے کیا ہوتا ہے

بزمِ دشمن ہے خُدا کے لئے آرام سے بیٹھ

بار بار اے دلِ ناداں تجھے کیا ہوتا ہے

میری صورت، مری حالت، مری رنگت دیکھی

آپ نے دیکھ لیا عشق میں کیا ہوتا ہے

اے صبا! خارِ مغیلاں کو سُنا دے مژدہ

عازمِ دشت کوئی آبلہ پا ہوتا ہے

ہم جو کہتے ہیں ہمیشہ ہی غلط کہتے ہیں

آپ کا حکم درست اور بجا ہوتا ہے

مرا مضموں سوارِ توسنِ طبعِ رواں ہو کر

زمینِ شعر پر پھرتا ہے گویا آسماں ہو کر

کھٹک جاتے ہیں چشمِ برق میں میرا نشاں ہو کر

غضب ڈھاتے ہیں یعنی چند تنکے آشیاں ہو کر

سن اے جوشِ جنوں تقلیدِ مجنوں کی نہیں اچھی

مبادا ہم بھی رہ جائیں کسی دن داستاں ہو کر

دمادم شعبدے ہم کو دکھاتا ہے کوئی جلوہ

کہیں شیخِ حرم ہو کر کہیں پیرِ مغاں ہو کر

ان آنکھوں سے بہارِ باغِ دنیا دیکھنے والو!

یہ آنکھیں رنگ لائیں گی کسی دن خوں فشاں ہو کر

ابھی کیا شمع کیا پروانہ دونوں جل بجھے آخر

کوئی آتش فشاں ہو کر کوئی آتش بجاں ہو کر

خدا محفوظ رکھے یہ حسیں دل لے ہی لیتے ہیں

کسی پر مہرباں ہو کر کسی سے سرگراں ہو کر

نہ پایا اور کچھ بھی جُز خدا کیسے میں لے اختر

بہت نادم ہوئے ہم بُت کدے سے بدگماں ہو کر

مرے چمن کی خزاں مطمئن رہے کہ یہاں

خدا کے فضل سے اندیشۂ بہار نہیں

سُنا کر حال قسمت آزما کر لوٹ آئے ہیں

انہیں کچھ اور بیگانہ بنا کر لوٹ آئے ہیں

پھر اک ٹوٹا ہوا رشتہ پھر اک اُجڑی ہوئی دُنیا

پھر اک دل چسپ افسانہ سُنا کر لوٹ آئے ہیں

فریبِ آرزو اب تو نہ دے لے مرگِ مایوسی!

ہم امیدوں کی اک دُنیا لٹا کر لوٹ آئے ہیں

خدا شاہد ہے اب تو اِن سا بھی کوئی نہیں مِلتا

بزعمِ خویش جن کو آزما کر لوٹ آئے ہیں

پچھے جاتے ہیں یارب کیوں کسی کافر کے قدموں میں

وہ سجدے جو درِ کعبہ پہ جا کر لوٹ آئے ہیں

بڑا ارمان تھا دیکھیں کبھی غالب کا کلکتہ

خدا کا شکر ہے دامن چھڑا کر لوٹ آئے ہیں

تمھارے اک تبسّم سے جو بن جاتی تھی نورانی

وہی غم کی گھٹا پھر چھا گئی کیا تم نہ آؤ گے

تمھاری دید ہی مقصد رہا جس کی بصارت کا

وہ چشمِ منتظر پتھرا گئی کیا تم نہ آؤ گے

وفا کی سسکیاں اس پر ہوس کے قہقہے توبہ

محبّت کی فضا تھرا گئی کیا تم نہ آؤ گے

بہارِ جاں فزا، بُلبُل کے نغمے، چاندنی راتیں

ہر اک شے آنے والی آ گئی کیا تم نہ آؤ گے

غرورِ ضبط کی رُسوائیاں کیا تم نہ دیکھو گے

مری فریاد لب تک آ گئی کیا تم نہ آؤ گے

مرے پندار کا اب ذکر کیا میں خود جو کہتا ہوں

طبیعت ہجر میں گھبرا گئی کیا تم نہ آؤ گے

جمع ہیں سارے مسافر ناخدائے دل کے پاس

کشتیٔ ہستی نظر آتی ہے اب ساحل کے پاس

ناخدا! کس جستجو میں ہے یہاں مجنوں کہاں

اب بگولا بھی نہ بھٹکے گا ترے محمل کے پاس

ابتدائے عشق یعنی ایک مہلک حادثہ

آ گئی ہستی یکایک موت کی منزل کے پاس

نعمتوں کو دیکھتا ہے اور ہنس دیتا ہے دل

محوِ حیرت ہوں کہ آخر کیا ہے میرے دل کے پاس

یہ ترے دستِ کرم کو کھینچ لے گا ایک دن

اے خدا رہنے نہ دے دستِ دعا سائل کے پاس

نگاہوں کو زباں کا ترجماں کہنا ہی پڑتا ہے

خموشی کو کبھی دل کی زباں کہنا ہی پڑتا ہے

خدائے دو جہاں جب آنجہانی ہو کے رہ جائے

کسی کو پھر خدائے این جہاں کہنا ہی پڑتا ہے

نہیں جب شش جہت میں داد ملتی رونے والوں کو

تو پھر تجھ کو اسیرِ لامکاں کہنا ہی پڑتا ہے

تری غفلت سے غیرت کا سفینہ ڈوب جاتا ہے

تو قطرے کو محیطِ بے کراں کہنا ہی پڑتا ہے

کسی کے حسنِ عالم تاب کی تنویر کے دورے تھے

کسی بدبخت کی صورت بھی پہچانی نہیں جاتی

مروّت کی ادا پر بند آنکھیں کر کے لُٹ جانا

یہ نادانی سہی لیکن یہ نادانی نہیں جاتی

وہاں دل لے چلا ہے پھر وہی اک بات کہنے کو

کہی جاتی ہے جو اکثر مگر مانی نہیں جاتی

خداوندا پھر آخر کیا تمنا ہے مرے دل کی

وہ پہلو میں بھی ہیں لیکن پریشانی نہیں جاتی

کیا تھا میں نے شکوہ آپ نے آنکھیں جھکا لی تھیں

ہوئی مدت مگر اب تک پشیمانی نہیں جاتی

وہی ہے اپنی رندی اور وہی واعظ کی فہمائش

بُری عادت کوئی بھی ہو بہ آسانی نہیں جاتی

عجب کیا تھا جو میں روزِ ازل ایمان لے آیا

عجب یہ ہے کہ اب تک بھی مرا ایمان باقی ہے

نمودِ خیر و شر کا یہ نتیجہ کس نے سوچا تھا

خدا مغرور، آدم جاں طلب شیطان باقی ہے

جب چشمِ تصور کو ہم کام میں لائے ہیں

اللہ غنی کیا کیا نقشے نظر آئے ہیں

جو نقش محبت نے اک بت میں دکھائے ہیں

موجود تھے کچھ پہلے کچھ ہم نے بنائے ہیں

فکرِ عقبیٰ ہے مجھے خواہش دنیا ہے مجھے

عیش کی دُھن ہے مجھے، موت کا دھڑکا ہے مجھے

موت کہتے ہیں جسے ضبط کی تکمیل نہ ہو

کہ تنفّس پہ بھی فریاد کا دھوکا ہے مجھے

حُسن وہ چاہیئے جو عشق کا آئینہ ہے

یعنی اپنے لئے اپنی ہی تمنّا ہے مجھے

تم نہ گھبراؤ مجھے تم سے کوئی کام نہیں

اپنی خواہش ہے مجھے اپنی تمنّا ہے مجھے

یہ تو معلوم نہیں ان کا ارادہ کیا ہے

ہاں نگاہِ غلط انداز سے دیکھا ہے مجھے

ہجر کی شب اِدھر اللہ اُدھر وہ بُت ہے

دیکھنا یہ ہے کہ اب کون بلاتا ہے مجھے

ایک بُت، ایک ہی بُت کا ہوں پجاری اخترؔ

اپنے اس شرک پہ توحید کا دعوے ہے مجھے

داتا ہے بڑا رزاق مرا بھرپور خزانے ہیں اس کے

یہ سچ ہے مگر اے دستِ دعا ہر روز تقاضا کون کرے

خلوصِ عارضی وہ بھی بہ قیمت ڈھونڈنے نکلے

تماشا نامراد آیا، تمنّا سوگوار آئی

دلِ مایوس نے آوارگی سے آس باندھی تھی

مری قسمت مگر یہ آخری بازی بھی ہار آئی

جب ہنسنے والے عشق کی ذلّت پہ ہنس چکے

ہم نے پھر اس کا نام لیا اور رو دیئے

پہلے تو شرمِ ضبط سے چُپ تھے حضورِ دوست

پھر حوصلے سے کام لیا اور رو دیئے

بے لوث محبّت کی نظر ڈھونڈ رہا ہوں

انجام تو ظاہر ہے مگر ڈھونڈ رہا ہوں

اے دیکھنے والو مری اُفتاد تو دیکھو

میں اپنی دعاؤں میں اثر ڈھونڈ رہا ہوں

جن سجدوں کی ہے عرشِ بریں کو بھی تمنّا

اُن سجدوں کے لائق کوئی در ڈھونڈ رہا ہوں

خود جس نے مجھے نازِ گناہوں پہ سکھایا

یارب وہی رحمت کی نظر ڈھونڈ رہا ہوں

اوجِ رسالت

کس نے قطروں کو ملایا اور دریا کر دیا

کس نے ذرّوں کو اُٹھایا اور صحرا کر دیا

شوکتِ مغرور کا کس شخص نے توڑا طلسم

منہدم کس نے الٰہی قصرِ کسریٰ کر دیا

کس کی حکمت نے یتیموں کو کیا دُرِّ یتیم

اور غلاموں کو زمانے بھر کا مولا کر دیا

زندہ ہو جاتے ہیں جو مرتے ہیں حق کے نام پر

اللہ اللہ موت کو کس نے مسیحا کر دیا

کہ دیا لا تقنطوا خستہ کسی نے کان میں

اور دل کو سر بسر محوِ تمنا کر دیا

سات پردوں میں چھپا بیٹھا تھا حسنِ کائنات

اب کسی نے اس کو عالم آشکارا کر دیا

آدمیت کا غرض ساماں مہیا کر دیا

اک عرب نے آدمی کا بول بالا کر دیا

محبّت میں تپاکِ ظاہری سے کچھ نہیں ہوتا
جہاں دل کو لگی ہو دل لگی سے کچھ نہیں ہوتا

یہ ہے جبرِ مشیّت یا مری تقدیر ہے یا رب
سہارا جس کا لیتا ہوں اسی سے کچھ نہیں ہوتا

کوئی میری خطا ہے یا تری صنعت کی خامی ہے
فرشتے کہہ رہے ہیں آدمی سے کچھ نہیں ہوتا

ترے احکام کی دنیا مرے اعمال کا محشر
یہاں میری وہاں تیری خوشی سے کچھ نہیں ہوتا

رضا تیری، لکھا تقدیر کا، میری زیاں کوشی
کسی کی دوستی یا دشمنی سے کچھ نہیں ہوتا

بہ ہر عالم ترا جبرِ خدائی کارفرما ہے

ہمارے اختیارِ بندگی سے کچھ نہیں ہوتا

اگر تیری خوشی ہے تیرے بندوں کی مسرت میں

تو اے میرے خدا! تیری خوشی سے کچھ نہیں ہوتا

مرے دستِ طلب کو جرأتِ گستاخ دے یارب

یہاں دستِ دعا کی عاجزی سے کچھ نہیں ہوتا

صداقت ہو تو دب جاتا ہے ایماں کفرِ مطلق سے

مرا منہ تک رہے ہیں شیخ جی سے کچھ نہیں ہوتا

کمالِ شاعری حاصل کیا تو یہ کھلا اختر

کہ دنیا میں کمالِ شاعری سے کچھ نہیں ہوتا

اک نہتا بے نیازِ کاوشِ بود و نبود

اک مسلح اور فکرِ عافیت میں غرق ہے

پوچھنے والے یہ دونوں میں کسی سے پوچھ لیں

بزدلی اور آتمک شکتی میں کتنا فرق ہے

ہونٹوں کو سرِ قلب سیا جاتا ہے

تب نام شہیدوں کا لیا جاتا ہے

کیا جانے زباں جامِ شہادت کے مزے

یہ جام تو شہ رگ سے پیا جاتا ہے

عبادت از پئے انعام زاہد
ہوس کاری ہے مشتاقی نہیں ہے
کہ تیرا مرکز سعی و تمنّا
شراب و جام ہے ساقی نہیں ہے

کہیں افراطِ مے ہے چہرہ افروز
کہیں خونِ جگر باقی نہیں ہے
مجالِ دم زدن کس کو ہے یارب
مگر یہ شانِ رزّاقی نہیں ہے

اپنی مظلومی اور احباب کی بدکیشی کو
دامِ تزویر بنایا ہے زمانے کے لئے
ان کی موہوم شقاوت کے گلے کرتا ہوں
اپنی معلوم خباثت کو چھپانے کے لئے

زندگی بھر دہر کی نیرنگیاں دیکھا کیے

گردشِ ایام و دورِ آسماں دیکھا کیے

ہم اسیرانِ قفس کی ہائے رے مجبوریاں

سامنے آنکھوں کے جلتا آشیاں دیکھا کیے

آشیاں باندھا کیے ہر فصلِ گل میں ہمصفیر

اور ہم اپنے قفس کی تیلیاں دیکھا کیے

آشیاں باندھا مگر آسودگی کا ذکر کیا

کس طرح گرتی ہیں اس پہ بجلیاں دیکھا کیے

جان بھی آخر مرض کے ساتھ رخصت ہوگئی

ہم تری رہ اے مسیحائے زماں دیکھا کیے

تمہاری دوستی اچھی نہ دل کی دشمنی اچھی
اُسے دشمن تمہیں اپنا بنا کر ہم نے دیکھا ہے

ہمیں معلوم ہے مرگ تمنّا کس کو کہتے ہیں
ہمیں اپنا مقدّر آزما کر ہم نے دیکھا ہے

صورت سے وہ بیزار ہے معلوم نہیں کیوں
دل پھر بھی طلب گار ہے معلوم نہیں کیوں

ہر شخص کو بخشی گئی تمیزِ بد و نیک
ہر شخص زیاں کار ہے معلوم نہیں کیوں

اک چیز کہ سرمایۂ راحت ہے اسے لوگ
کہتے ہیں کہ آزار ہے معلوم نہیں کیوں

پتّا بھی اگر ہلتا ہے تو اس کی رضا سے
اور بندہ گنہگار ہے معلوم نہیں کیوں

دیندار ہے زاہد کی زباں بھی مرا دل بھی
پھر مفت کی تکرار ہے معلوم نہیں کیوں

وقتِ آخر عمر بھر کے سب فسانے کہہ گئی
وہ پشیمانی تری اور اس پہ حیرانی مری

اپنی اپنی منزلِ مقصود پہ لے جائے گی
دوستوں کو اُن کی عقل اور مجھ کو نادانی مری

جی کو روگ لگا بیٹھا جی کے روگ سے مرتا ہوں

اس میں کسی کا شکوہ کیسا اپنی کرنی بھرتا ہوں

ترکِ گناہ اے واعظ جی! دل سے نہیں مجبوری ہے

آپ خدا سے ڈرتے ہیں میں دنیا سے ڈرتا ہوں

دُنیا سے کچھ فیض نہ تھا دنیا کو تج بیٹھا ہوں

اللہ سے امیدیں ہیں اللہ اللہ کرتا ہوں

دُور تو ہٹ جاؤں لیکن فکرِ محبت نے مارا

بے حد نازک رشتہ ہے ٹوٹ نہ جائے ڈرتا ہوں

کاوشِ پیہم آخر تک، حاصل مرگِ مایوسی

یہ بھی کوئی جینا ہے کس جینے پر مرتا ہوں

بُرا ہو گیا یا بھلا ہو گیا
محبّت میں جو ہو گیا ہو گیا

نہ پوچھو سرِ حشر زاہد کا حال
سمجھتے تھے کیا اور کیا ہو گیا

یہیں ختم ہے بحثِ معیارِ حُسن
جو دل لے گیا دلربا ہو گیا

الٰہی ترا بندہ اور بُت پرست
مگر یہ کہ مجبور سا ہو گیا

لیجئے پھر اعتبار اُن کا کیا
ہم نے اپنے ساتھ پھر دھوکا کیا
سرگرانی کا سبب آخر کوئی
کیا خطا کی جُرم ہم نے کیا کیا

خدا کی تو اک دل لگی ہو گئی
یہاں وقفِ غم زندگی ہو گئی
فسانہ وہ دشمن کا سُننے لگے
مری بات آئی گئی ہو گئی

تماشا ہے، کوئی جن کے لئے برباد ہوتا ہے

وہی احباب ناصح بن کے سمجھانے بھی آتے ہیں

دیا جنّت کا لالچ شیخ! ہم سے یہ کہا ہوتا

چلو کعبے کے رستے میں صنم خانے بھی آتے ہیں

برائے عیش و مستی بھی ہے شغلِ مے، مگر یارب

تری دنیا میں کچھ بدبخت غم کھانے بھی آتے ہیں

جنھیں سن کر ضمیرِ حضرتِ یزداں لرز جائے

کتابِ زندگی میں ایسے افسانے بھی آتے ہیں

جو مانگو مل جائے گا اس میں وہ بھی شامل ہیں
خوب نمازیں پڑھتا ہوں، خوب دعائیں کرتا ہوں

ناؤ کو اک ساحل تو ملا، طوفانوں سے چین تو ہے
موت ہے اچھا موت سہی، میں اس گھاٹ اُترتا ہوں

ہمارا ذکر دشمن کی زبانی دیکھتے جاؤ

فسانہ بن گئی ساری کہانی دیکھتے جاؤ

ذرا اک چھیڑ دو زاہد سے قصّے حور و غلماں کے

پھر اس کم بخت کی رنگیں بیانی دیکھتے جاؤ

ٹپک لے خون ارمانوں کا آنکھوں سے ذرا ٹھہرو

مری لٹتی ہوئی رنگیں جوانی دیکھتے جاؤ

کمالِ سوزِ غم ہائے نہانی ڈھونڈنے والو

مآلِ سوزِ غم ہائے نہانی دیکھتے جاؤ

بہت چرچے تھے یاروں میں مری جادو بیانی کے

حضورِ دوست میری بے زبانی دیکھتے جاؤ

ملے گی شیخ کو جنّت مجھے دوزخ عطا ہوگا

بس اتنی بات ہے جس کے لئے محشر بپا ہوگا

رہیں دو دو فرشتے ساتھ تو انصاف کیا ہوگا

کسی نے کچھ لکھا ہوگا، کسی نے کچھ لکھا ہوگا

بروزِ حشر حاکم قادرِ مطلق خدا ہوگا

فرشتوں کے لکھے اور شیخ کی باتوں سے کیا ہوگا

مرکّب ہوں میں نسیان و خطا سے کیا لکھوں یارب

کبھی حرفِ تمنّا بھی زباں پر آگیا ہوگا

سکونِ مستقل، دل بے تمنّا، شیخ کی صحبت

یہ جنّت ہے تو اس جنّت سے دوزخ کیا بُرا ہوگا

مرے اشعار پہ خاموش ہے جز بز نہیں ہوتا

یہ واعظ واعظوں میں کچھ حقیقت آشنا ہوگا

تری دنیا میں صبر و شکر سے ہم نے بسر کر لی

تری دنیا سے بڑھ کر بھی ترے دوزخ میں کیا ہوگا

بھروسا کس قدر ہے تجھ کو اختر اس کی رحمت پر

اگر وہ شیخ صاحب کا خدا نکلا تو کیا ہوگا

شبِ غم وہم سنتا ہے صدائیں
گماں ہوتا ہے کوئی آ رہا ہے

ستم کوشی میں دل سوزی بھی شامل ہوتی جاتی ہے
محبّت اور مشکل اور مشکل ہوتی جاتی ہے

مجھ کو دیکھا پھوٹ کے رویا
اب سمجھا سمجھانے والا

رمز آشنا ملے کئی اہلِ نظر ملے

پھر بھی یہ جستجو رہی کوئی بشر ملے

عادل بھی ہو رحیم بھی ہو کارساز بھی

سب کچھ تو ہو مگر ذرا ہم سے نظر ملے

انکارِ سجدہ ہے یہاں کس رُوسیاہ کو

شایانِ سجدہ بھی تو مگر کوئی در ملے

یہ ہے کمالِ جہل کہ معراجِ آگہی

ہر لمحہ جستجو ہے کچھ اپنی خبر ملے

عیشِ گریز پا کا تصوّر بھی مٹ گیا

غم ایسے مستقل ملے اور اس قدر ملے

کوئی بجلی ادھر نہیں آتی

موت بھی راہ پر نہیں آتی

شبِ ہجراں کا ماجرا ہی کیا

شام آ کر سحر نہیں آتی

عشق جی کا زیاں تو ہے لیکن

موت کچھ پوچھ کر نہیں آتی

دردِ دل کا علاج ترکِ وفا

شرم اے چارہ گر نہیں آتی

شکر ایماں ہے شکوہ کفر مگر

وجہ کوئی نظر نہیں آتی

جاں نثاری کا مدعی ہے رقیب

جان بچتی نظر نہیں آتی

کیا جانے کیا ہوئی مری عادت شراب کی
گویا وہ اک ترنگ تھی عہدِ شباب کی

وہ ولولے وہ جوش جوانی کے اب کہاں
ساتھ آفتاب کے گئی دھوپ آفتاب کی

صحیفے بھی پیمبر بھی ترے ابلیس بھی تیرا

الٰہی روزِ محشر امتحاں تیرا ہے یا میرا

ترے مُجرنے کی رُسوا مری فطرت تری صنعت

قصور اس میں بتا اے بدگماں تیرا ہے یا میرا

علامت میرے عصیاں کی ہے بیشک داغِ پیشانی

مگر یہ داغِ دل یارب نشاں تیرا ہے یا میرا

فریب حضرت آدم کو دے گیا ابلیس
قریب ہی تھا خدا بھی خدا سے کچھ نہ ہُوا
خدا تو خیر مسلماں تھا اُس سے کیا شکوہ
مرے لئے مرے پرماتما سے کچھ نہ ہُوا

میکدے میں بیٹھ کر ایمان کی پروا نہ کر

یا اسے بھی ایک دو چلو پلا دیوانہ کر

مسکرا دے قصۂ امید کر دے مختصر

یا بڑھا لے چل ذرا سی بات کو افسانہ کر

خوش مذاقی شرط ہو جس کے نظارے کے لئے

اُس گُلِ خودرو کو یارب زینتِ ویرانہ کر

حادثہ ہے لیکن ایسا غیر معمولی نہیں

شمع پر پروانہ جلنے دے کوئی پروا نہ کر

خودی تلاش میں مجھی آخر اک بہانہ ملا

کہ بندگی نہ کریں گے اگر خدا نہ ملا

حرم کو جا نہ سکے بتکدے کے راندے ہوئے

بُتوں کے بعد خُدا کا بھی آسرا نہ ملا

چاہتا ہوں انتہائے دردِ دل

مل گئی آخر دوائے دردِ دل

کیا ضروری تھی دوائے دردِ دل

سُن تو لیتے ماجرائے دردِ دل

عشق کی وجہِ ندامت کچھ نہ پوچھ

دل ہے پہلو میں بجائے دردِ دل

جس کو دل لینے پہ اتنا ناز ہے

کاش ہوتا آشنائے دردِ دل

یوں نہیں مٹنے کی اختر یہ خلش

دل کہیں آئے تو جائے دردِ دل

غرورِ ضبط سے آہ و فغاں تک بات آ پہنچی

ہوس نے کیا کیا دل سے زباں تک آ پہنچی

سکونِ دل سے ناقوس و اذاں تک بات آ پہنچی

خلافت سے جبیں و آستاں تک بات آ پہنچی

ملی تھی آنکھ اور آہ و فغاں تک بات آ پہنچی

ذرا سی بات تھی لیکن یہاں تک بات آ پہنچی

ہماری داستاں میں ذکرِ قیس و کوہ کن آیا

وہاں سے پھر ہماری داستاں تک بات آ پہنچی

جہانِ دوستی اک جنتِ ایثار ہوتا ہے

وہاں بھی کاہشِ سود و زیاں تک بات آ پہنچی

فریبِ آزادی

کہیں ذکرِ مے دل نغمہ حدیثِ مطرب و ساقی

کہیں رنج تباہی کربِ ناداری ہے آزادی

کہیں اک نعرۂ عیشِ مسلسل بزمِ یاراں میں

کہیں اک مستقل اذنِ عزا داری ہے آزادی

اب اس کو نغمۂ شادی کہوں یا نالۂ ماتم

کہو تو سربلندی یا نگوں ساری ہے آزادی

شکایت کر نہیں سکتا منافق بن نہیں سکتا

مرے آزاد یارو سخت ناچاری ہے آزادی

اگر خلوت میں پوچھو ہر بشر نا مطمئن اس سے

سرِ محفل کہو تو جان سے پیاری ہے آزادی

غرض ہم مبتلا اس کے منافق بھی ہیں عاشق بھی

ہوا ثابت بڑی دلچسپ بیماری ہے آزادی

کسی کی جوانی ارے تو یہ تو یہ

پھر اپنی کہانی ارے تو یہ تو یہ

مسلسل مصیبت سراسر تباہی

مری زندگانی ارے تو یہ تو یہ

کیا بن کے رہ گئی ہے ذرا آ کے دیکھ لے

اک خانماں خراب کی دنیا ترے بغیر

کہتا پھروں ہر اک سے غمِ دل، کہاں یہ تاب

کہہ بھی سکوں تو کون سنے گا ترے بغیر

گوکل کی ایک شام

گوکل کے جھونپڑے میں جمنا کا ہے کنارا

اے دیدۂ تصور پھر کر لے اک نظارا

پورب سے آ رہی ہیں مستی بھری ہوائیں

پچھم میں جا رہی ہیں نیلو فری گھٹائیں

مغرب میں رفتہ رفتہ اک شام بن رہی ہے

پریوں کی سبز وادی گلفام بن رہی ہے

سیندور مل لیا ہے خورشید نے جبیں پر

جمنا نے اوڑھ لی ہے اک سُرخ زرد چادر

کھیتوں سے آ رہی ہیں کچھ رس بھری صدائیں
اک کیفِ سرمدی سے مخمور ہیں فضائیں

چھوٹا سا ایک لڑکا بنسی بجا رہا ہے
الفت کے بھولے بسرے نغمے سنا رہا ہے

پیغام برگلوں کے میں بسے ہوئے ہیں
یعنی ہوا کے جھونکے لے میں بسے ہوئے ہیں

کچے گھروں کے باہر کچھ گوپیاں کھڑی ہیں
اک دو یہاں کھڑی ہیں اک دو وہاں کھڑی ہیں

یہ بھولی بھالی شکلیں یہ منتظر نگاہیں
یہ گرم گرم آنسو یہ سرد سرد آہیں

یہ گوپیاں بچاری کچھ یاد کر رہی ہیں
لب ہیں خموش آنکھیں فریاد کر رہی ہیں

کیوں ہوک اُٹھ رہی ہے آرام کیوں نہیں ہے

شام آگئی ہے لیکن گھنشام کیوں نہیں ہے

اے بے وقوف اخترؔ دکھڑے ہیں یہ پُرانے

یہ راز کون سمجھے یہ بھید کون جانے

سلامِ شوق

(افغانستان جانے والے ہندوستانی وفد کے نام)

چلے ہو آج تم بھارت سے افغانوں کی دنیا کو

بہادر، باصفا، خود دار انسانوں کی دنیا کو

وہ دنیا جو ہمارے نیک ہمسایوں کی دنیا ہے

جسے ہم نے ہمیشہ پیار کی نظروں سے دیکھا ہے

ہے جس کے ساتھ ارضِ ہند کی تاریخ وابستہ

جہاں سے ہو کے ہم ہندوستاں میں آئے وہ رستہ

وہی خطہ وہی جس سے حکومت مشترک اپنی

تمدن مشترک اپنا، سیاست مشترک اپنی

وہ انساں لطف و اخلاص و مروت جن کا شیوہ ہے

شرافت جن کی خصلت ہے محبت جن کا شیوہ ہے

بڑے ہی پیار سے اُن کو سلامِ شوق پہنچانا

سلامِ شوق پہنچا کر پیامِ شوق پہنچانا

کہ اے والا نژادو، وادیٔ کابل کے فرزندو

شرافت کے پرستارو، وفا کے آرزومندو

ہم اہلِ ہند تجدیدِ محبت کرنے آئے ہیں

پرانے دوست تازہ رسمِ الفت کرنے آئے ہیں

ریاضِ ہند سے تازہ ہوائیں لے کے آئے ہیں

تمہارے واسطے مخلص دعائیں لے کے آئے ہیں

مگر یہ مت سمجھنا منہ سے کہہ دینا ہی کافی ہے

ثبوت اس کا وہاں کردار سے دینا ضروری ہے

وہاں جاتے ہو تم اپنے وطن کے ایلچی بن کر

سراپا آشتی بن کر، مجسّم دوستی بن کر

وطن کا نام ہو جس سے وہاں وہ اپنی خو رکھنا

وطن کی شان رکھنا، لاج رکھنا، آبرو رکھنا

وطن کی جس سے سُبکی ہو نہ لب تک بھی وہ حرف آئے

کہیں ہندوستاں کے نام پر دھبّا نہ آجائے

خُدا حافظ سِدھارو، نونہالانِ وطن جاؤ

دعا یہ ہے سلامت جاؤ تم اور شاد کام آؤ